پروفیسر ایم اے مجید یزدانی

تصوّف کی حقیقت

لفظ صوفی یا تصوف قرآن مجید میں کہیں دکھائی نہیں دیتا لیکن شیخ ابوالنصر کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں صادقین، مخلصین، خائفین، عابدین اور اولیا اور ابرار وغیرہ کے الفاظ جن مومنوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں وہ اولیاء و صوفیا ہی تو ہیں، کیا ہوا اگر لفظ "صوفی" بالتصریح مذکور نہیں[1]۔ اسی طرح شیخ شہاب الدین سہروردی لکھتے ہیں کہ لفظِ صوفی قرآن میں نہیں آیا لیکن "مقربین" سے مراد یہی لوگ (صوفیاء ہی) ہیں۔ البتہ یہ کہ مقرب جب تک صاحب حال نہ ہو محض متصوف ہے اور جب صاحب حال ہو جائے تب صوفی کہلاتا ہے[2]۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رہے کہ دیگر علوم اسلامی مثلاً فقہ، تفسیر، حدیث اور ان سے متعلقہ الفاظ فقیہہ، مفسّر اور محدّث وغیرہ بھی قرآن پاک میں موجود نہیں جبکہ آج ان کی حیثیت مسلّم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل سے سمجھاتے رہے اس لیے اُس عہدِ مبارک میں لوگ ان علوم کے محتاج ہی نہ تھے البتہ آپؐ کے بعد مطالبِ کلام اللہ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے علم تفسیر، اور اس کی عملی مثالیں پیش کرنے کے لیے علم حدیث، اور ان ہر دو کی روشنی میں معاشرتی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے علم فقہ کی ضرورت لاحق ہوئی بلکہ آگے چل کر علم الکلام اور دیگر علوم بتدریج وجود میں آتے چلے گئے ورنہ عہد رسالت میں تو خود قرآن مجید بھی اس مکتوبی صورت میں اعراب، علاماتِ وقف سے مزین اور پاروں، سورتوں، رکوعوں اور آیتوں کے ساتھ مدون نہیں ہوا تھا[3]۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ کتاب وسنت کی حقیقی روح اور باطنی معنی کو برقرار رکھنے کے لیے تصوف وجود میں آیا۔" اسلام میں تصوف" کے عنوان سے نکلسن نے جو کتاب لکھی ہے، اس میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ،" اگر کسی طور سے اسلام کو دنیا بھر کے مذاہب اور فلسفوں سے یکسر علیحدہ رکھا جاتا تب بھی اس میں تصوف ایک نہ ایک شکل میں ضرور ظاہر ہو کر رہتا کیونکہ اس کے بیج تو پہلے ہی سے (اس کے اصلی سرچشمہ یعنی) قرآن مجید (اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات اور اندازِ زیست میں موجود تھے ... نیز اللہ تعالیٰ کا ایک نام" ودود" ہے جو محبت کے معنی ومفہوم پر دلالت

کرتا ہے [۱] اسی خیال کا اظہار شاہ ولی اللہ نے ہمعات میں کیا ہے۔ "اسلام میں تصوف کا پیدا ہو جانا مذہبی زندگی کا ایک فطری تقاضا تھا۔ جہاں تک تصوف کی اصل روح کا تعلق ہے یہ خود عہد رسالت اور صحابہ کرام کے زمانے میں موجود تھی گو اس وقت اس کا یہ نام نہ تھا اور نہ یہ شکل جو چند صدیوں بعد مرتب ہوئی" [۲] ویسے تاریخی اعتبار سے چند صدیاں بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ خواجہ حسن بصریؒ کو عام طور پر اولین صوفی قرار دیا گیا ہے جن کی ولادت ۲۱ھ / ۶۴۲ء اور وفات ۱۱۰ھ / ۷۲۸ء میں واقع ہوئی ابونصر سراج کا بیان ہے کہ ان کے زمانے میں یہ لفظ رائج تھا۔ [۳] بلکہ ایک روایت کے مطابق یہ لفظ ان سے بھی پہلے جابر بن حیان کے نام کے ساتھ استعمال ہوا جو کوفہ میں رہتے تھے۔ [۴] دونوں میں اولیت کا شرف چاہے کسی کو حاصل رہا ہو یہ بہرحال مسلم ہے کہ تصوف کے اولین مرکز بصرہ اور کوفہ ہی تھے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ان اصحاب نے صوفی کہلانے پر فخر یا اصرار کیا ہو کیونکہ عہد رسالت میں صحابی سے بڑھ کر قابلِ احترام کوئی لفظ ہو نہیں سکتا تھا کہ ان سے راضی ہونے کی بشارت تو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں بھی دی ہے اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا اعزاز بھی کچھ کم باعثِ برکت نہ تھا البتہ دو صدی بعد لفظ صوفی زاہد زمانہ کے لیے موجب راحت و تسکین قرار پایا اور صوفیا و تصوف کی اصطلاح باقاعدہ ظہور میں آئی جو آج تک جاری ہے۔

تصوف کی کوئی جامع تعریف آج تک ممکن نہ ہو سکی کیونکہ ہر صوفی کے اپنے اپنے واردات و مشاہدات ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صوفیا کے اقوال اس ضمن میں مختلف ہیں جنہیں دہرانے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ ڈاکٹر مصطفےٰ حلمی پروفیسر فلسفہ اسلام جامعہ قاہرہ لکھتے ہیں کہ — "تصوف ایک ایسا علم ہے جو قلب کے باطنی احوال پر مرتب ہونے والے احکام کے ساتھ مخصوص ہے اور اس حیثیت سے وہ اسلامی علوم شرعیہ میں سے ان علوم کا مقابل ہے جن کا مطمح نظر ظاہری احکام ہیں۔ گویا وہ قلب کی ریاضت اور مجاہدہ نفس کا علم ہے جس سے ذوق و مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور اس طرح نہ صرف علم ہے اور نہ صرف عمل بلکہ دونوں کا مجموعہ ہے علم یوں کہ اس سے انسان آفاتِ نفس سے واقف ہوتا ہے اور عمل یوں کہ اس علم کو عملی جامہ پہنا کر اخلاقِ عالیہ کی قدریں نمایاں کی جاتی ہیں تاکہ خیر کا ظہور ہو اور شر رفع ہو جائے اور پھر اس عمل سے ایک نیا علم حاصل ہوتا ہے جسے صوفیا معرفت یا عرفان کا نام دیتے ہیں۔ پس تصوف نفس انسانی کو مہذب بنانے کا علم ہے اور اسے مذموم اخلاق سے پاک کر کے اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ کرنے کا عمل ہے [۵]" گویا اس کی وہی حیثیت ہوئی جو سائنس کے مطالعہ میں عملی تجربات کی ہوتی ہے۔ پروفیسر علی حسن عبدالقادر نے لکھا ہے —

"جنید اور ہجویری دونوں کے نزدیک تصوف انسان اور خدا کے درمیان فاصلے کو ختم کرنے کا علم ہے، اور تصوف کے مقامِ صحو کی فضیلت یہی ہے کہ اس درجے پر پہنچ کر ایک صوفی بنی نوعِ انسان کی صحیح طور پر رہنمائی کر سکتا ہے اور عوامی تصحیحِ اخلاق کا فریضہ کماحقہٗ سرانجام دے سکتا ہے۔ خدا سے دُوری کے باعث زندگی سے عدمِ اطمینان ہر دور میں انسان کو رہا ہے اور بعض کے ہاں یہ احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر اسی کا درماں تلاش کرنے میں گزار دیتے ہیں تاکہ اس کا علم ہو جائے تو دوسروں کو بھی راہِ نجات دکھا سکیں۔ یہی لوگ دنیا میں مذاہب اور فلسفوں کے بانی ہوتے ہیں اور ان کی آخری منزل یہی ہوتی ہے کہ خدا سے قُربت کی سعادت حاصل ہو جائے تاکہ بے چینی کا خاتمہ ہو سکے۔ لیکن تین بڑے مذاہب میں اس دوری کا تصوّر مختلف نظر آتا ہے، یہودیوں کے ہاں بھی خدا دُور ہے مگر وہ خلق کے درمیان میں ہے، عیسائیت میں "انسانی خدا" یعنی یسوعؑ، خدا اور انسان کی دوری کے درمیان واسطہ ہے، لیکن اسلام میں وہ دور ہوتے ہوئے بھی قریب ہے"، شہ رگ سے بھی قریب تر"۔

(ہر دو حرماں میں آخر کون ہے تیرے سوا — اے خوشا دردے کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے)

تصوّف کو "تصوف اسلام" کہنا ایک فیشن سا ہو گیا ہے حالانکہ یہ ترکیب درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ تصوّف تو اسلام کے اندر ہی موجود ہے، دونوں میں کوئی مغائرت نہیں۔ مستشرقین اگر اسے "اسلامک مسٹیزم" کہتے ہیں تو حق بجانب ہیں کیونکہ "مسٹیزم" پرانی چیز ہے اور اپنے اپنے رنگ میں ہر مذہب میں موجود رہی ہے لیکن تصوف کا سرچشمہ اسلام ہے اور اسلام کا مرکز و محور توحید ہے وحدتِ الٰہی کہ اس کا کوئی شریک نہیں، مثل نہیں، وہ قادرِ مطلق ہے، کوئی چیز اس کے حکم سے باہر نہیں، اس کا کوئی اوتار نہیں (چنانچہ اسے ہندو تصورات سے ماخوذ یا متاثر کیونکر کہہ سکتے ہیں جہاں کرشن جی فرماتے ہیں کہ "میں اپنی مایا کے زور سے پیدا ہوا ہوں")، کوئی اس کے سوا نجات دہندہ نہیں (پس اسے عیسائیت سے کیا نسبت جہاں ساری سعادت و خوش بختی کا انحصار یسوعؑ کی نجات دہندہ الوہیت میں ہے)، یہاں تو پیغمبر بھی محض ایک "عبد" ہے اور صرف اس لیے برگزیدہ ہے کہ وہ اس کا رسول ہے اور جس کی تقلید و نقل اس لیے ضروری ہے کہ اس کا منتخب کردہ ہے اور اس سے ہمکلام ہوتا ہے۔ پس صوفی اسی ذاتِ واحد کی خاطر سنتِ رسولؐ کا پابند اور حدیثِ رسولؐ کا دل و جان سے مقلد ہے کہ بالآخر فنا فی اللہ ہو کر بقا باللہ کی سعادت حاصل ہو جائے (پس اسے مہاتما بدھ کے نروان سے بھی مشابہت

نہیں ہو سکتی جہاں فنا سے مراد محض فنائے جسم ہے اور جن کے نزدیک زندگی بجائے خود ایک کثافت ہے، جس کا خاتمہ ضروری ہے۔ خود شناسی یا معرفت کا وہ تصوّر ان کے ہاں دکھائی نہیں دیتا جو تصوف کی روح ہے وہ تو کرم یعنی بار بار جنم کی مصیبت سے نجات چاہتے ہیں اور بس [۱۲] سا پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ منکرِ خدا ہیں) البتہ جیسے کہ اوپر بیان ہوا خدا سے نزدیکی واتحاد کا نظریہ تصوف کے وجود میں آنے سے پہلے بھی موجود تھا۔ مثلاً پلاٹی نس (۲۰۵ء تا ۲۷۰ء) نے فلسفہ افلاطون کو ایک زندہ و پایندہ انداز زیست بنا کر نو افلاطونیت کو ایک مذہب بنا دیا۔ جس میں تفکر و استغراق کے علاوہ تزکیۂ نفس اور صفائے باطن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں اسے ارسطو پر بھی سبقت حاصل ہے کیونکہ وہ اہلِ صفا کے ارتقائی مدارج کا بھی قائل ہے اور اُس کے نزدیک انسان اگر چاہے تو اسی منبع اور اصل کی طرف بھی پہنچ سکتا ہے جہاں سے وہ آیا ہے اور یہ آنے جانے کا یہ مسلسل عمل جو کائنات میں جاری و ساری ہے، ابدی ہے۔ بے ساختہ ہے اور لازم بھی ہے کیونکہ اس "واحد" کی طرف مراجعت کی تڑپ ہر روح میں پائی جاتی ہے اس واحد کا نام اس نے خدا نہیں رکھا بلکہ لفظ "نیکی" یا "خیر" سے موسوم کیا ہے۔ تاہم یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اس کی کوئی جامع و مانع تعریف ممکن نہیں کیونکہ وہ خیال اور زبان و بیان کی رسائی سے باہر ہے۔ پس اس کے تعین کے بجائے اس کی تلاش پر توجہ مرکوز رہنی چاہیئے۔ خیر کا اولین تخلیقی عمل ذہن و فراست ہے، جس کا دوسرا نام اس نے روح یا جان بتایا ہے اور اس لازم کا ملزوم باطن یا متنفس ہے۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا جبکہ یہ مادی کائنات موجود نہ تھی۔ وحدتِ وجود کے مبہم سے اشارے بھی موجود ہیں [۱۳] جن سے آگے چل کر صوفیا میں سے محی الدین ابن عربی صریحاً متاثر نظر آتے ہیں۔ خیر و صاً روح کے معرفت تک پہنچنے اور پھر کُل میں مل جانے کی کیفیت ابن عربی کے ہاں بعینہٖ وہ ہے جو پلاٹی نس نے بیان کی ہے لیکن یہ عجب کی بات ہے کہ تصوّف میں فلسفیانہ افکار نے راہ پالی تھی۔ ورنہ "تصوف بنیادی طور پر تو تزکیۂ نفس اور صفائے معاملات کا علم تھا۔ البتہ اسلام کی دوسری نسل کے بعد یہ خواہش مغلوب ہوتی گئی اور سوالات، جوابات، کتب اور رسالوں کی بھرمار ہونے لگی جن میں دیگر مقاصد کا عمل دخل بھی تھا [۱۴]" تلاش کرنے سے بعض مشابہتیں ہندو فلسفہ میں بھی نظر آجاتی ہیں مثلاً کا تھو اپنشد کے چوتھے باب میں تیئسویں بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ معرفتِ ذات نہ ویدوں کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور نہ کسی اور طریقے سے بلکہ خود ذاتِ مطلق ہی سے اس کی توفیق عطا ہوا کرتی ہے جسے ہو جائے (اور توفیق

وعنایاتِ خداوندی صوفیا کا راسخ عقیدہ ہے) اسی طرح کینا اپنشد کے گیارھویں باب کے یہ الفاظ کہ "اسے صرف وہی سمجھتا ہے جو اُسے نہیں سمجھتا"[15] بالکل اسی مفہوم کے حامل ہیں جو عمر خیام کے اس مصرعہ میں پائے جاتے ہیں سے معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد (اور یہ بھی دراصل سقراط کا مقولہ ہے) بھگوت گیتا کے مطابق کرم یوگ (عمل)، گیان یوگ (علم یعنی دانش) اور بھگتی یوگ (محبت) یکجا ہو جائیں تو یوگ کی تکمیل ہو جاتی ہے اور یوگی سمادھی کے مقام پر براجمان ہو جاتا ہے[16]۔ اور یہ تصور صوفیا کی منازلِ سلوک یعنی شریعت، طریقت اور حقیقت سے گزرنے کے مشابہ ہے لیکن تصوف تو اس سے آگے بقا باللہ تک لے جاتا ہے جبکہ ویدانت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ سمادھی تک پہنچ کر بھی ہر فرد بہرحال ناپاک ہے اور بقائے دوام اسے حاصل ہو ہی نہیں سکتی[17]۔ اسی طرح صوفیا کے "ذکر" کو پرانیام (کنڈل یوگ) سے مشابہ بلکہ بعض اوقات ماخوذ بتایا گیا ہے حالانکہ یوگی اس شکتی کو مافوق العادۃ شعبدہ بازی کے لیے حاصل کرتا ہے[18] جبکہ صوفیا کے ہاں اس سے مراد محض یادِ الٰہی ہے۔ پتنجلی کے سوتر نمبر ۵۰ تا ۵۵ اسی پرانیام (حبسِ دم) سے متعلق ہیں جن پر عمل کرنے سے حالتِ شعور میں ایک معرفت سی حاصل ہوتی ہے لیکن اس میں ارادہ کو دخل حاصل نہیں[19] (حالانکہ تصوف میں ابتدائے سلوک ہوتی ہی ارادہ سے ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو جوگیوں کی تعلیمات میں قوتِ تخلیق کوئی کردار ادا نہیں کرتی[20] جبکہ اسلام میں معاملہ اس کے برعکس ہے کہ ؎

آں کہ او را قوتِ تخلیق نیست   نزدِ ما جُز کافر و زندیق نیست

اور پھر ہندو تپسوی پرانیام کے ماہر ہونے کے باوجود اس کے مخترع نہیں کہ اس کا سراغ مصریوں میں بھی ملتا ہے اور یہودی و عیسائی راہب تو اس میں باقاعدہ مہارت رکھتے تھے۔ لیکن صوفیا کے مشغلۂ ذکر میں شعبدہ بازی یا اظہارِ کرامت کی کوئی خواہش کارفرما نہ تھی، وہاں تو قرآن پاک کے یہ الفاظ مشعلِ راہ تھے کہ "مجھ کو پکارو، میں تمہاری درخواست سنوں گا۔ (سورۃ المومن آیت ۶۰)" تم اللہ کو کثرت سے یاد کرو کہ تم کو فلاح ہو" (سورہ الجمعہ آیت ۱۰) اسی طرح ان کے ہر عمل سے متعلق جو محرکات تھے وہ خالص اسلامی تھے، اسلام کو ان کے تصوف پر تقدم حاصل تھا بلکہ تصوف عزیز ہی اس لیے تھا کہ وہ ان کی نظر میں اسلام یعنی توحید پرستی کی خالص ترین صورت تھی۔ سورۃ لقمان کی بیسویں آیت پڑھی کہ "اللہ نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر مکمل کر دیں" تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ظاہر سے مراد شریعت ہے اور باطن سے طریقت۔ اور اس ضمن میں صحیح بخاری سے حضرت ابوہریرہ کی یہ روایت بھی ان کے سامنے بطورِ ثبوت

موجود تھی کہ "میں نے حضورؐ سے علم کے دو ظرف حاصل کیے ان میں سے ایک تو میں نے تم پر فاش کر دیا اگر دوسرے کو فاش کرتا تو میرا یہ حلق کاٹا جاتا" (صوفیاء کے نزدیک اس "دوسرے علم" کا اشارہ علم باطن یا طریقت کی طرف ہے)، تسلیم و رضا کی محرک کئی آیات ہو سکتی ہیں مثلاً "میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں" (المؤمن آیت ۴۴)۔ توکل کو تصوف میں ایک مستحکم ستون کی حیثیت حاصل ہے اور یہ اس لیے کہ اس کی تاکید واضح طور پر مثلاً اس آیت میں موجود ہے۔ "مجھ کو خدا کے آگے کسی چیز کا اختیار نہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم آپ پر توکل کرتے ہیں اور آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں" (الممتحنہ ۴) ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ۔ "اے انسان تو اپنے رب کے پاس پہنچنے کے لیے برابر کوشش کر رہا ہے" تو صوفیاء نے مجاہدہ و ریاضت کو اپنا شعار بنا لیا۔ ان کے نزدیک پیغمبر حضورؐ کی زندگی میں بھوک، صبر، دولت سے نفرت، عیش و راحت سے روگردانی، شب بیداری وغیرہ سب تصوف ہی کے روپ ہیں۔ جناب صدیق اکبرؓ کا سب کچھ رسولِ خدا کی خدمت میں لا ڈالنا ان کے قناعت و ایثار کی اولین صوفیانہ مثال تھی۔ تخلیق آدمؑ کی ترکیب اور موسیٰؑ کی اللہ سے ہمکلامی بھی تصوف کی جھلک لیے ہوئے ہے۔ صحیح ترمذی میں مذکورہ حدیث "جدھر منہ کرو اللہ کا منہ ہے" اور سورۂ الحدید آیت ۳ کے الفاظ "وہی اول ہے وہی آخر، وہی ظاہر ہے وہی باطن" جذبۂ توحید پرستی کے لیے مہمیز ثابت ہوئے۔ حدیث شریف میں دیکھا کہ "مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے" تو تصورِ شیخ کی تحریک عمل میں آئی اور یوں ضرورتِ مرشد صوفیا کے ہر مکتب فکر میں تسلیم کی گئی کیونکہ مبتدی کے لیے راہنما کی ضرورت دنیا کے ہر کام میں اور ہر گام پر محسوس ہوتی ہے۔ بیعت کے اس تصور کو اکثر نشانہ تعریض بنایا گیا ہے لیکن شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ القول الجمیل میں جو ارشاد فرمایا ہے وہ اس ضمن میں کم و بیش قولِ فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔ "بیعت کا اطلاق صرف بیعتِ خلافت تک محدود نہیں بلکہ عہدِ نبوت میں بیعت کی مختلف صورتیں تھیں ــــ بیعتِ خلافت، بیعتِ جہاد، بیعتِ توبہ وغیرہ صوفیا کی مروجہ بیعت بیعتِ تقویٰ میں داخل ہے" عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں ــــ "مادی علوم میں کون سا علم و فن ہے جس میں استاد کی مدد ناگزیر نہیں حالانکہ ہر علم و فن پر بیشمار کتابیں موجود ہیں، پھر روحانیت کا علم جو ان سب سے لطیف تر ہے وہ محض کتابوں کی مدد سے کس طرح پورا آ جائے گا؟ پس اس منزل کے راہنما کا نام مرشد ہے" لفظ صحابی ہی صحبت کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے پس صحبت مرشد بدعت نہیں بلکہ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کی تعمیل ہے یعنی "اے ایمان والو، تم صادقوں کی صحبت اختیار کرو" ــــ پس یہی مریدی ہے[۲۱] کتاب و سنت

سے اسی والہانہ شیفتگی کے تحت قرآن مجید کی بعض آیات کی تشریح صوفیا نے علما سے بہتر کی ہے اور قرآنی مقطعات یعنی ا ل م ، ق ، ص وغیرہ کو معانی کا جامہ پہنایا اور اسے علم باطن سے موسوم کیا جن کے معنی مرشد ہی مرید کو سمجھا سکتا ہے مثلاً ا ل م سے ان کے نزدیک مراد ہے " اللہ ، لوح محفوظ ، محمد "[۲۱] یہ بھی کہا گیا ہے کہ تصوف سماجی ناانصافیوں کے خلاف ایک ردِ عمل تھا جس طرح بدھ مت برہمنیت کے خلاف ایک سوشل انقلاب تھا جیسا کہ بنیچ شیلا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے ' نیز یہ کہ یہ ایک نفسیاتی ردِ عمل تھا کہ عرب مسلسل جنگ سے تنگ آچکے تھے اور صوفیائے جہاد بالشمشیر کو جہادِ اصغر اور مجاہدہ نفس کو جہاد اکبر قرار دے کر جہاد اصغر سے فرار کا موقع بہم پہنچا دیا لیکن حقیقت یہی ہے کہ تصوف کسی ردِ عمل نہیں بلکہ عمل کا نام ہے۔

ردِ عمل اس کے مخالفین کی طرف سے البتہ ہوا اور (۱) شیعوں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ اس سے امام کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی تھی اور خدا سے براہِ راست تعلق قائم ہو جاتا تھا (۲) معتزلہ نے مخالفت کی کہ خدا سے بندے کی محبت کہنے سے دونوں میں تشبیہہ کا پہلو نکلتا ہے ، (۳) حشویہ نے کہا کہ یہ ظاہری عبادات و فرائض کی خلاف ورزی ہے (۴) ظاہریہ کو اعتراض تھا کہ عشقِ خالق و مخلوق سے بات حلول تک جا پہنچتی ہے (۵) علماء و متکلمین برہم ہوئے کہ باطنی نفاق کی کوئی سزا قرآن پاک کی رو سے موجود نہیں صرف ظاہری جرائم پر حد لگائی جا سکتی ہے۔ اسی مخاصمت کی وجہ سے تیسری صدی میں جب بغداد تصوف کا مرکز بنا تو نفوذ تنہائی کے باوجود صوفیا کو انتظامیہ سے بھی ٹکر لینی ہی پڑی اور ۲۴۰ھ / ۸۵۴ء میں ذوالنون مصری پر مقدمہ چلایا گیا ۲۶۱ھ / ۸۷۴ء میں سہل تستری کو توبہ و فرض کے نظریے کی بناء پر بصرہ سے جلاوطن کیا گیا اور بالآخر ۲۶ مارچ ۹۲۲ء (۳۰۹ھ) کو منصور حلاج کو انا الحق کہنے کی پاداش میں سولی پر لٹکا دیا گیا۔ صوفیا اور علماء کے درمیان اس شدید کشیدگی کو دور کرنے کے لیے ابوبکر ابن اسحٰق الکلاباذی (وفات ۳۸۰ھ) کی گرانقدر تصنیف کتاب التعارف لمذہب التصوف نے بڑا اہم کردار ادا کیا جس سے آگے چل کر امام غزالی نے استفادہ کیا اور بالآخر احیاء العلوم الدین لکھ کر علم دین اور علم تصوف میں توافق و ہم آہنگی پیدا کر دی"[۲۳] اور ثابت کر دیا کہ تصوف پیغمبرؐ کے ارشادات کے مطابق خود شناسی و خدا شناسی کا راستہ ہے"[۲۴] ، اور تصوف کا دفاع کچھ اس انداز سے کیا کہ راسخ العقیدہ بھی اس میں سکون پانے لگے یہاں تک عیسائی علماء دین نے بھی اعتراف کیا، کہ اگسٹائن کے بعد کسی نے دفاعِ مذہب اور پاکیزگیٔ خیال کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ نہ کیا تھا" اور بلاشبہ امام غزالی کا دل وجان سے تصوف کو قبول کر لینا صوفیا کی سب سے بڑی فتح تھی"[۲۵] پس تصوف کی

حقیقت بیان کرتے ہوئے عصر حاضر کے ایک مشہور عالم دین نے بالکل درست کہا ہے کہ "فقہ کا تعلق انسان کے ظاہری عمل سے ہے، اس کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ (بوقت عمل) تمہارے دل کا کیا حال تھا؟ دل کے حال سے جو چیز بحث کرتی ہے اس کا نام تصوف ہے جو درحقیقت خدا اور رسولؐ کی سچی محبت بلکہ عشق کا نام ہے پس تصوف شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں، قرآن میں اس کا نام تزکیہ اور حکمت ہے، حدیث میں اسے احسان کہا گیا ہے اور بعد میں اسے تصوف کہا گیا۔"

حواشی

[1] کتاب اللمع (ابوالنصر سراج) دیباچہ مولف ۱۔ [2] عوارف المعارف (شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی) ترجمہ صفحہ ۴۳ [3] تصوف اسلام (عبدالماجد دریا بادی) اعظم گڑھ ۱۹۴۶ء صفحہ ۱۱۳، [4] دی مسٹی سزم آف اسلام (نکلسن) لنڈن ۱۹۱۴ صفحہ ۲۰-۱۹ [5] لمعات (ترجمہ محمد سرور) ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۵ [6] مولانا جامی (نفحات الانس صفحہ ۳۵ پر) لکھتے ہیں کہ صوفی کا "لقب" سب سے پہلے ابو ہاشم متوفی ۱۵۰ھ/۷۶۶ء کو دیا گیا [7] شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ لیڈن ۱۹۰۳ء صفحہ ۵۸۰ [8] ماہنامہ تاج کراچی۔ اپریل ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۵ [9] مقالہ علی حسن۔ الازہر یونیورسٹی صفحہ ۸۰ [10] یوگا اینڈ ویسٹرن سائیکالوجی (کاسٹر) مطبوعہ لنڈن ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۶ [11] اسلام ابیلیفس اینڈ پریکٹسز۔ ٹرٹن۔ مطبوعہ لنڈن ۱۹۵۷ء صفحہ ۹۴۔ [12] بھگوت گیتا۔ باب چہارم (بحوالہ مسٹک ٹنڈنسیز ان اسلام بمبئی ۱۹۳۲ء صفحہ ۴۵۔ [13] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا ۱۹۶۷ء جلد ۱۵ صفحہ ۱۱۲۹ [14] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا ۱۹۶۷ء جلد دوم صفحہ ۵۹-۵۸، [15] مارٹن لنگز۔ اے مسلم سینٹ آف ٹوئنٹیتھ سنچری لنڈن ۱۹۶۱ء صفحہ ۴۲۔ [16] انٹروڈکشن ٹو کمپیریٹو مسٹی سزم۔ جیکویز ڈی مارکویٹ۔ نیویارک ۱۹۴۹ء صفحہ ۳۵، [17] دی تھری پاتھ (ڈیوینز وِد گاڈ) اینی بیسنٹ۔ بنارس ۱۸۹۷ء صفحہ ۵، [18] دی ورائٹیز آف ریلجس ایکسپیرئینس۔ ولیم جیمز۔ نیویارک طبع ۲۷ صفحہ ۴۰ [19] دی مسٹرس کنڈلینی۔ وسنت جی ریلی بمبئی ۱۹۲۹ء صفحہ ۸۷، [20] یوگا اینڈ ویسٹرن سائکالوجی صفحہ ۱۱۹، [21] اے ورنٹ ٹو اے ۱۱ naw ۹۔ ایڈورڈ کارپنٹر۔ لنڈن ۱۸۹۲ء صفحہ ۳۴ [22] تصوف اسلام صفحہ ۲۱۸-۱۹ [23] این ایگزامینیشن آف مسٹک ٹنڈنسیز ان اسلام۔ ظہور الدین احمد۔ بمبئی ۱۹۳۲ء صفحہ ۹۴-۹۳ [24] اے۔ جے آربری "صوفیا کے نظریات" دیباچہ صفحہ ۱۵ [25] انٹروڈکشن ٹو صوفی ڈاکٹرین (ابرک بارڈ) ترجمہ ڈی ایم میتھی سن۔ لندن ۱۹۵۹ء صفحہ ۳۱، [26] دی ایج آف فیتھ۔ ولیم ڈیورنٹ۔ نیویارک ۱۹۵۰ء صفحہ ۳۳۲